اِفاداتِ قاسمیہ

یعنی

حجۃ الاسلام

حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ

کے

بعض مضامین کی تسہیل و تشریح

از

حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوریؒ

پیش لفظ

حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوریؒ نے حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے علوم کی تسہیل و تشریح کی غرض سے "اِفاداتِ قاسمیہ" کے نام سے ایک مضمون لکھا تھا – یہ مضمون قسط وار شکل میں ماہنامہ الفرقان لکھنؤ میں (بمطابق ربیع الآخر ، جمادی الاول ، جمادی الآخر ۱۳۹۳ھ) شائع ہوا تھا – افادۂ عام کیلئے اسکو یکجا شکل میں شئیر کیا جا رہا ہے-

شوکت علی

افاداتِ قاسمیہ

از امام کبیر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ

(مرتبہ مولانا سعید احمد صاحب پالنپوری، استاذ دار العلوم اشرفیہ)

(راندیر ضلع سورت)

تمہید: حجۃ الاسلام حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: "اُمت میں چار عالم —— امام غزالی، محی الدین ابن عربی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی —— ایسے گزرے ہیں جن کی تصانیف کے ساتھ مزاولت سے آدمی اگر غبی بھی ہو تو ذہین ہو جاتا ہے" —— حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ مذکورہ مقولہ نقل فرما کر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ: "پانچویں کا میں اضافہ کرتا ہوں اور وہ ہیں "حضرت الاستاذ" یعنی حضرت نانوتوی رحمہ اللہ (دیباچہ مصابیح التراویح صفحہ ۵)

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ "قاسمی تبرکات" سہل الحصول نہیں ہیں، علوم قاسمیہ کے کما حقہ سمجھنے کے لیے کئی فنون سے مناسبت ضروری ہے۔ اس ہیچ میرز کی عرصہ سے خواہش ہے کہ حضرت رحمہ اللہ کے علوم کی شرح و تدوین کر دوں۔ آج سے بنام خدا یہ سلسلہ شروع کرتا ہوں، اہل علم سے درخواست ہے کہ حضرت قدس سرہ کے علوم سے استفادہ فرمائیں اور حضرت رحمہ اللہ کی کتابوں پر گہری نظر رکھنے والے بزرگوں سے التماس ہے کہ اگر کسی جگہ تسامح ہو جائے تو رہبری فرمائیں۔

طریقہ کار یہ رکھا گیا ہے کہ عنوان اور سوال خود تجویز کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اگر حضرت قدس سرہ کی عبارت سلیس اردو میں ہے تو جواب میں اسے بعینہ مع حوالہ درج کیا گیا ہے، اور اگر فارسی ہے یا خالص علمی اصطلاحات میں ہے تو اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھا گیا ہے پھر حضرت رحمہ اللہ کی عبارت مع حوالہ نقل کی گئی ہے۔ واللہ ولی التوفیق —— (مُرتّب)

۱:- زیارتِ قبور

سوال: (۱) مردوں کے لیے زیارتِ قبور جائز ہے یا نہیں؟

(۲) عورتوں کے لیے کیا حکم ہے؟

(۳) بعض روایات میں زیارتِ قبور کے لیے جانے والی عورت پر لعنت کی گئی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟

جوابات۔ (۱) مردوں کے لیے زیارتِ قبور مسنون ہے، سنّت پر عمل کی نیت سے قبروں کی زیارت کرنا چاہیے ــــ یعنی یہ کہ زیارتِ قبور اور اس کی اجازت آنحضرتؐ سے ثابت[۱] ہے اور اس سے آپؐ کا منشاء تھا کہ موت کی یاددہانی اور عبرت حاصل ہو۔ ان شاء اللہ مناسب اجر و ثواب ملے گا۔

"زیارتِ قبور مرداں را مسنون است، کہ بہ نیتِ ادائے سنت ــــ کہ ہماں طریقہ مرویست و بہر عبرت و تذکرِ موت تجویز کردہ شد ــــ زیارتِ قبور خواہند کرد، ان شاء اللہ تعالیٰ اجر مناسب خواہند یافت۔" (فیوض قاسمیہ صفحہ ۴ مطبوعہ اعزازیہ دیوبند)

(۲) عورتوں کے لیے احتراز (بچنا) ضروری ہے، کیونکہ زیارتِ قبور کے لیے جانے والی عورتوں پر احادیث میں اللہ کی لعنت (رحمت سے محرومی) وارد[۲] ہوئی ہے۔

"آرے! درباره زناں کہ بہر زیارتِ قبور روند لعنت خدا در احادیث مرویست بناءً علیہ زناں را احتراز ضروری است۔" (حوالۂ بالا)

---

[۱] حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا فَإِنَّهَا تُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُ الْآخِرَةَ۔ (ابن ماجہ)

"میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے روکا تھا، پر اب زیارت کرو قبروں کی کیونکہ زیارتِ قبور سے دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے اور آخرت یاد آتی ہے۔" (ابن ماجہ)

[۲] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کے لیے جانے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

(۳) صریح حکم سن لینے کے بعد مؤمن کے لیے زیبا نہیں ہے کہ چون وچرا کرے اور لعنت و ممانعت کی وجہ پوچھے۔ لیکن تمصلحۃً اشارہ کرتا ہوں:

عورتوں کے لیے زیارت قبور کی اجازت دینے میں اندیشہ تھا کہ ان کی ناسمجھی اور بے صبری کی وجہ سے رسوم مشرکانہ وبدعات کا رواج ہو جائے گا ——— اور بالآخر یہ اندیشہ واقعہ بن کر رہا۔ نیز ان کی بے تابی بے قراری اور نوحہ وزاری کا خوف بھی تھا، بہر حال اس حقیقت کے پیش نظر اجازت میں دینی نفع تو چنداں تھا نہیں، البتہ نقصان بہت زیادہ تھا، اور قاعدہ ہے کہ "غالب کی رعایت کی جاتی ہے" قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیات میں اسی قاعدہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے:

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ۔ (القارعہ)	جس کا نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو گیا سو وہ تو من پسند عیش میں پہونچ گیا۔

شراب اور جوئے کے بارے میں ارشاد باری ہے۔

فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ (البقرۃ)	ان دونوں میں بڑا گناہ ہے، اور لوگوں کے لیے چند منافع بھی ہیں۔ البتہ ان کے نقصانات نفع سے زیادہ ہیں۔

پس غلبۂ مفاسد کی وجہ سے عورتوں کے لیے زیارت قبور کی ممانعت مناسب معلوم ہوئی اور اسی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی اور مردوں کے متعلق مذکورہ بالا اندیشہ نہ تھا اس لیے ان کے لیے اجازت مناسب معلوم ہوئی، وہ عبرت پذیری اور تذکیر موت کی صورت میں ثواب کے مستحق ہوں گے۔[1]

---

[1] قال الترمذی: قال بعض اہل العلم: انما کرہ زیارۃ القبور للنساء لقلۃ صبرھن، و کثرۃ جزعھن الخ۔ کتب فقہیہ میں اصح قول یہ لکھا ہے کہ زیارت قبور مرد و زن سب کے لیے جائز ہے نور الایضاح میں ہے۔ ندب زیارتھا للرجال والنساء علی الاصح نیز حدیث کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور الخ بھی عام ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ ممانعت دونوں صنفوں کے لیے ختم ہو گئی ہے اور جس حدیث میں (باقی اگلے صفحہ پر)

"از استماع حکم صریح کار اہل ایمان نیست کہ چون و چرا کنند، و از وجہ لعنت و ممانعت پرسند، مگر بنظر دور اندیشی رمزے آں ہم میگویم۔

زبے خردیٔ زناں و بے صبری شاں ـــــ ہر دو عیاں است ـــــ در صورت اجازت زیارت اندیشۂ رواج مراسم شرک و بدعت بود ـــــ و آخر کار مشہود شد ـــــ و خوف بے تابی و بے قراری و نوحہ زاری بود ـــــ چنانچہ ظاہر است۔ پس اندریں صورت نفع دینی چنداں نبود و نقصان دینی زیادہ۔ از آں برآمد موافق قاعدہ "رعایت غلبہ" کہ در آیۃ "فاما من ثقلت" و "فیہما اثم کبیر و منافع للناس و اثمہما اکبر من نفعہما" اشارہ باں فرمودہ اند، نہی از زیارت در خور حال شاں برآمد، بایں وجہ لعنت بر اوشاں کردند ـــــ از مرداں اندیشۂ مذکور، و خوف مسطور نبود، اجازت لائق شاں بنظر آمد، بوجہ حصول عبرت، و تذکیر موت امیدوار ثواب نمودند۔" (فیوض صفحہ ۴-۵)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لعنت وارد ہوئی ہو وہ نسخ سے پہلے کی ہوگی ـــــ لیکن جب عورتوں میں جہالت بڑھی اور طرح طرح کی رسوم و بدعات ایجاد کی جانے لگیں تو متاخرین احناف نے عورتوں کے لیے زیارت کے عدم جواز کو ترجیح دی۔ علامہ بدر الدین عینی بخاری شریف کی شرح میں لکھتے ہیں۔ وحاصل الکلام انہا تکرہ للنساء، بل تحرم فی ھذا الزمان، لاسیما نساء مصر لان خروجھن علی وجہ فیہ فساد وفتنۃ (عمدۃ القاری صفحہ ۷۰ ج ۸ ملخصاً) حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے بھی متاخرین کے قول کو اختیار فرمایا ہے۔ بلکہ حضرت کے جواب سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ اصل حکم عدم جواز ہی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ارشاد سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے بھائی کی قبر پر گئیں تو فرمایا: "اگر میں تمہاری وفات کے وقت موجود ہوتی تو پھر یہاں قبر پر نہ آتی" (مشکوٰۃ ۱/۱۴۹) لیکن چونکہ حضرت نانوتوی کی یہ رائے احناف کے اصح قول کے خلاف ہے اس لیے حضرت قدس سرہ ارقام فرماتے ہیں:

"ایں تجویز شاید سرمایۂ پریشانیٔ ناظراں، و موجب حیرانیٔ ابناء روزگار شود، مگر چہ کنم مفتی نیم، نہ سامان افتاء در بر دارم، آنچہ رقم زدم بپاس خاطر سامی رقم زدم، و می ترسم مبادا بہ تہمت مخالفت اکابر اہل سنت بندہ را بے وجہ ابناء روزگار مجرم قرار دادہ غوغا کنند و قیامت بر سرم بپا کنند فقط (فیوض صفحہ ۵)

(۲) ذو الفقار[1]

سوال :- حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مشہور تلوار "ذو الفقار" کی کیا حقیقت ہے؟ وہ آپؓ کے پاس کہاں سے آئی؟ اور کس طرح آئی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد کس کے پاس گئی؟ شیعہ حضرات اس کے متعلق جو روایات بیان کرتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے؟

جواب :- شیعہ حضرات نے "ذو الفقار" کے متعلق جو افسانے عوام کے کانوں میں ڈالے ہیں وہ سب سراسر غلط ہیں۔ اس کی حقیقت صرف اس قدر سمجھنا چاہیے کہ جب حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام کے جم غفیر کے اصرار سے بیعت خلافت قبول کی تو امور خلافت کے انصرام اور اوقاف وبیت المال کی نگرانی کو اپنا فرض منصبی سمجھا۔ اور چونکہ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ جانتے تھے اسلیئے ان کے روبرو اپنا تمام ترکہ وقف کردیا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انھیں کسی قسم کا خلجان پیش نہ آئے اور حقیقت حال سے ناواقفی کی بنا پر وہ کوئی اور انتظام نہ کر بیٹھیں۔

اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرما دیا تھا: لانورث ماترکناہ فھو صدقۃ یعنی چونکہ نبی وفات کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں اس لیئے ہم اپنے وارثوں کے لیے "مورث" نہیں بنیں گے، ہم جو کچھ چھوڑ کر جائیں گے وہ سب صدقہ ہوگا، میراث نہ ہوگا، یعنی راہ خدا میں جس کو جو مناسب سمجھیں دے دیں۔ بنا بریں علیہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آراضی کو اہل بیت وازواج مطہرات کے نان ونفقہ کے لیے رکھ چھوڑا اور اشیائے منقولہ بطور تبرک تقسیم فرمادیں۔ چند چیزیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حصہ میں آئیں۔ منجملہ اُن کے تلوار بھی تھی جس کا نام ذو الفقار مشہور ہے[2]۔ کتب احادیث سے حضرت امام

---

[1] اصل لفظ فار کے فتحہ سے ہے لیکن عوام کسرہ پڑھتے ہیں۔ (مرقات شرح مشکوٰۃ ۲۸۰/۴)

[2] بدر کے مال غنیمت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیف ذو الفقار کو بطور صفی لیا تھا (مشکوٰۃ باب قسمۃ الغنائم ص۳۵۱) پھر یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملی (قاموس مادہ فقر)

زین العابدینؒ[1] تک اس کا پہونچنا بظن غالب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ ان کی وفات کے بعد وہ کس کے قبضہ میں گئی۔ بعض صحابہ نے تبرکاً اس کو مانگا تھا[2]۔ ممکن ہے کہ حضرت امام رحمۃ اللہ نے ان کے حوالہ کر دی ہو۔ واللہ اعلم۔

"القصہ ایں ہمہ افسانہائے" ذو الفقار" کہ از شیعاں بگوش عوام رسیدہ باشد سراسر غلط اند، اصل حقیقت آں نقط ایں قدر باید فہمید کہ پس از وفات حضرت سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات چوں بوجہ اصرار جم غفیر صحابۂ کرام صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ دست اہل بیعت گرفتند، انتظام مہام خلافت، ونگہداری بیت المال واوقاف فرض منصب خود دانستند، لیکن حضرت سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ و التسلیمات بلحاظ آنکہ حضرت ابو بکر را جانشین خود فہمیدہ بودند، روبروئے اوشاں ہمہ ترکۂ خود را وقف فرمودند، تا پس از وفات حضرت شاں صلی اللہ علیہ وسلم علیحدہ جانشین پائے شاں نشود، ومبادا بوجہ بے علمی از حقیقت حال — یعنی وقف بودن آں — بطور دیگر انتظام آں کنند، بایں وجہ اگر فرمودند روبروئے حضرت صدیق فرمودند" یعنی ارشاد رفت" لا نورث ما ترکنٰہ صدقۃ" مطلب ایں جملۂ ایںست کہ بوجہ ایںست کہ بوجہ حیات النبی بودن مورث وارثاں لمی تو انیم شد، ہر چہ بگذاشتہ رویم آں ہمہ صدقہ

---

[1] اسم شریف علی، لقب زین العابدین، سلسلہ نسب: ابن حسین بن علی بن ابی طالب ہے، اور شہرت "علی اصغر" سے ہے۔ ولادت ۳۸ھ میں اور وفات ۹۴ھ میں ہوئی۔

[2] جب امام زین العابدین اپنے والد ماجد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے جام شہادت نوش کرنے کے بعد مدینہ شریف واپس تشریف لائے تو حضرت مسور بن مخرمہ زہری قرشی (۲ — ۶۴ھ) نے، جو صغار صحابہ میں ہیں، وہ تلوار تبرکاً مانگی تھی۔ ابو داؤد شریف باب ما یکرہ ان یجمع بینھن (کتاب النکاح) میں روایت ہے: قال مسور لہ، ھل انت معطی سیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ فانی اخاف ان یغلبک القوم علیہ! وأیم اللہ! لئن اعطیتنیہ لا یخلص الیہ ابداً حتی یبلغ الی نفسی (ج ۱ ص ۲۹۰) لیکن حضرت امام کا عطا فرمانا اس روایت میں مذکور نہیں ہے۔

باشد، نہ میراث، یعنی براہ خدا ہر کرا مناسب دانند بدہند، نظر بریں حضرت ابوبکر صدیق رضی را بہر نان ونفقہ اہل بیت وازواج گذاشتند، واشیائے منقولہ را بطور تبرک تقسیم فرمود، چند اشیاء بحصہ حضرت علی امیر المومنین کرم اللہ وجہہ آمد منجملہ آں شمشیر ہم بود کہ نامش "ذوالفقار" مشہور است، ورسیدنش تا بحضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ از کتب احادیث بظن غالب معلوم می شود، پس از وفات حضرت شاں ندانیم بدست کہ افتاد، مگر آنکہ بعض صحابہ بغرض تبرک سوال آں کردہ بود، حضرت امام حوالہ شاں فرمودہ باشد واللہ اعلم اینست آں چیکہ در کتب معتبرہ خواہد بود، وسوائے ایں ہرچہ گفتہ اند، یا می گویند، ہمہ بے اصل می نماید (فیوض صـ ۱۱-۱۲)

(۳) یا رسول اللہ!

سوال :- کوئی شخص درود میں صرف "الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ" پڑھے تو جائز اور کافی ہو گا؟

جواب[۱] : "الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ" بہت مختصر ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر نہ سمجھنا چاہیے، ورنہ اسلام کیا ہو گا؟ کفر ہو گا! بلکہ یوں سمجھے (کہ) یہ پیام فرشتے پہونچاتے ہیں۔" (فیوض صـ ۲۹)

(۴) مرشد مرید کے ہمراہ

"مرشدوں کی نسبت یہ خیال غلط ہے کہ وہ ہر دم ساتھ رہتے ہیں، اور ہر دم آگاہ رہتے ہیں۔ یہ (تو) خداہی کی شان ہے (البتہ) گہہ وبیگاہ ـ بطور خرق عادت ـ بعض اکابر سے ایسے

---

[۱] حضورؐ کے لیے علم غیب کا عقیدہ رکھ کر "یا رسول اللہ" کہنا کفر ہے، اور اگر یہ عقیدہ نہیں تو مشابہ بکفر ہے۔ البتہ اس کلمہ کو درود شریف کے ضمن میں کہے اور یہ عقیدہ رکھے کہ ملائکہ اس درود شریف کو آپ کے سامنے عرض کرتے ہیں تو درست ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ ملائکہ بندۂ مومن کا درود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرتے ہیں اور ملائکہ کی ایک صنف اسی خدمت پر مقرر ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ صـ ۹۶)

معاملات ظاہر ہوئے ہیں، اس سے جاہلوں کو یہ دھوکا پڑا ہے"۔ (فیوض ص۱۴۹)

(۵) کیا گروہ بندیاں ختم ہو سکتی ہیں؟

"اس زمانے میں یہ توقع بے جا ہے کہ اختلاف اُٹھ جائے اور اتحاد پیدا ہو جائے۔ اگر
بالعموم ابنار روزگار میں فہم و انصاف ہوتا تو بعد فہمائش ممکن تھا کہ یہ اختلاف اُٹھ جاتا، مگر آپ جانتے
ہیں کہ آج کل یہ دونوں باتیں نصیب اعدا ہیں۔ یہ اختلاف ہی موجب عداوت ہے اور یہ عداوت
باہمی موجب منفر (تنفر) یکدگر ہے، اس لیے کوئی کسی کی نہیں سنتا، اور بے سمجھے دوسروں کے
رسم و راہ کو غلط سمجھتا ہے، پھر آپ ہی فرمائیں (جب) یہ حال ہو تو کیا حال ہوگا؟! اس صورت
میں توقع فہم و انصاف ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ ہر کسی کی خود رائی، اُدھر مذہب باطل کی
خوش نمائی اور (بھی) موجب ازدیاد ترقی باطل ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سب جانتے ہیں، خدا کے کیسے پیارے تھے؟! اور کیسے بلند ہمت
اور اولوالعزم تھے؟! پھر بنی اسرائیل پر ان کا کتنا بڑا احسان تھا کہ غلامی فرعون و قوم سے چھڑا کر بادشاہ
مملکت وسیعہ بنا دیا، مگر تس پر (یعنی باوجود اس کے) تسلیم احکام میں اتنی سرتابی کرتے تھے کہ بعض بعض
دفعہ پہاڑ کو اٹھا کر سر پر معلق کر دیا، تو (یعنی تب) حکم مانا، نہیں تو نہیں (مانا)، اور سامری نے ایک کرشمہ
بے معنی دکھلایا اور سب کے سب جھٹ پٹ اسکے حلقہ بگوش ہو گئے! آواز بے معنی کجا اور معجزات
موسیٰ کجا! پھر کرشمہ سامری بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز کا طفیل تھا۔ نہ حضرت جبرئیل
علیہ السلام ان کی مدد کو آتے نہ ان کی اسپ مادہ کے سُم کی تاثیر سامری کو نظر پڑتی، نہ اس کرشمہ
کی نوبت آتی۔ پھر حضرت موسیٰ کجا اور سامری مردود، دغاباز کجا! مگر چونکہ اسکی رسم و راہ یعنی ڈھول
ڈھمکا، روشنی چراغی، مرغوبات طبعی میں سے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ارشادات نفس
پر دشوار (تھے)، تو (یعنی اس لیے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اتباع دشوار تھا اور سامری کا اتباع
سہل ——— غرض اس زمانہ میں مذاہب باطلہ بوجہ مذکور قابل ارتفاع نہیں"۔ (یعنی یہ توقع
نہیں کہ وہ ختم ہو جائیں گے اور ان پر چلنے والے راہ حق پر آجائیں گے)" فیوض ص۱۴۹

(۶) جمعہ کی پہلی اذان

سوال:- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جمعہ کی پہلی اذان کیوں بڑھائی؟ وجہ کیا ہے؟ —

جواب:- خطبۂ جمعہ کا اصلی مقصد وعظ سننا ہے (اور جب مدینہ کی آبادی بڑھی اور دور تک پھیل گئی تو منبر والی اذان سب لوگ نہیں سن سکتے تھے نیز لوگوں میں سستی راہ پانے لگی چنانچہ تبکیر (جمعہ کی نماز کے لیے جلد جانا) کا اہتمام ختم ہوگیا، تو) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خطبہ والی اذان سے پہلے ایک اذان بڑھائی تاکہ لوگوں کے پہونچنے میں تاخیر نہ ہو اور خطبہ کا اصلی مقصد حاصل ہوسکے۔

"غرض اصلی استماع است ...... وشاید ہمیں است کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اذانے دیگر قبل از اذانِ خطبہ افزودند، تا نہ باشد کہ در رسیدنِ جامعاں دیر شود، وخطبہ بیکار رود — غرض بوجہ غرض مذکور — باوجود مقرر بودن یک اذان کہ بر ہر ہر نماز مقرر است — اذانے دیگر بیشتر از اذانِ خطبہ افزودہ شد، تا مطلب اصلی بوجہ احسن بدست آید" (فیوض ص۲۷)

(۷) حدیث: من کنتُ مولاہ فعلیٌّ مولاہ

سوال:- حدیث "من کنتُ مولاہ فعلیٌّ مولاہ" کا مرتبہ کیا ہے؟ اور معنی کیا ہیں؟ شیعہ حضرات "مولیٰ" کے معنی "حاکم" کرتے ہیں کیا یہ معنی صحیح ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کا ثبوت اس حدیث سے نکلتا ہے؟

جواب:- حدیث صحیح ہے، لیکن "مولیٰ" اور "ولی" کے اصلی معنی "دوست" ہیں، دونوں لفظ ایک ہی مصدر سے بنے ہیں اور ایک ہی معنی رکھتے ہیں، جس طرح کہ "ولی اللہ" اور "اولیاء اللہ" کے معنی "اللہ کے دوست" ہیں، "ولی" اور "اولیاء" کے معنی حاکم یا حکّام نہیں ہیں ورنہ "ولی اللہ"

ف وصار ذلك الاذان الذي بين يدي الخطيب لا يسمعه جميع اهل المدينة اھ (ابن حجر عسقلانی) او لما ظهرت البدعة ـ على ما قيل إنها اول البدع ـ وهي ترك التبكير اھ (ملا علی قاری)

کا مطلب ہوگا "خدا پر حاکم"۔ العیاذ باللہ!

دلیل یہ ہے کہ حدیثِ مذکور کا آخری حصہ اس طرح ہے۔ اللّٰھم وَالِ مَن وَالاہُ، وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ — یعنی "خدایا! اس شخص کو اپنا دوست بنا جو علیؓ کو اپنا دوست بنائے اور اس شخص سے عداوت رکھ جو علیؓ سے عداوت رکھے"۔ اگر حضراتِ شیعہ کا ترجمہ صحیح ہو تو جملۂ مذکورہ کا ترجمہ یوں کرنا ہوگا:

"خدایا! اس شخص پر حکومت کیجئے جو علیؓ پر حکومت کرے۔"

علاوہ بریں حدیث کا محلِ ورود یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی مقام پر بھیجا تھا، وہاں ان کے بعض ساتھیوں کو کچھ باتوں کی وجہ سے ان سے رنجش ہو گئی تھی، چنانچہ انھوں نے دربارِ نبوی میں آپؓ کی شکایت گزاری لیکن در حقیقت شکایت غلط فہمی اور حضرت علیؓ کی قدر ناشناسی پر مبنی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شکایت سن کر فرمایا:- مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ الخ یعنی جسے میں محبوب ہوں اسے علی بھی محبوب ہونے چاہئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ساتھیوں کی رنجش ختم ہو گئی۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے لیے لازم ہے حضرت علیؓ سے محبت کرنا اور یہ بات قرینِ عقل ہے۔ استاذ اور پیر سے محبت کے لیے استاذ زادگاں و پیرزادگان کی محبت لازم ہے۔ حضرت علیؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بمنزلۂ فرزند کے تھے اس لیے ان سے محبت بعینہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے۔

۱؎ یمن میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر سے خمس (مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ) وصول کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بھیجا تھا اور اسی سلسلہ میں ساتھیوں کو کچھ شکایات حضرت علیؓ سے پیدا ہوئی تھیں حضرت خالدؓ نے حضرت بُریدہ بن الحُصَیبؓ کو مامور کیا کہ وہ دربارِ نبوی میں شکایت پہنچائیں جب شکایت پہنچائی گئی تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من کنت مولاہ الخ جس کی وجہ سے حضرت علیؓ کو ابدی اہمیت حاصل ہو گئی چنانچہ مجلس سے نکلتے ہی حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: ھَنِیْئاً لَکَ یَا اَبَا الْحَسَنِ! لقد اَصْبَحْتَ مولیٰ کُلِّ مُؤْمِنٍ! مبارک! آج سے آپ ہر مومن کے دوست بن گئے! کیونکہ اب کون مومن ہوگا جو مومن بھی ہو دعویٰ حبِ رسول بھی کرے اور حضرت علیؓ سے محبت نہ رکھے؟ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

لیکن پیرزادگان کی خلافت و جانشینی ضروری نہیں ہے۔ اس کا تعلق قرابت سے نہیں ہے بلکہ جو شخص علم و زہد میں درجۂ کمال تک پہونچا ہوا ہوگا اور دوسروں سے گوئے سبقت لے چکا ہوگا وہی استاذ اور پیر کی خلافت کا مستحق ہوگا ـــــ مگر شیعہ حضرات خلافت کے مسئلہ کو سلاطینِ دنیا کی ولیعہدی پر قیاس کرتے ہیں اور حضرت علیؓ کو ترجیح دیتے ہیں لیکن انھیں معلوم نہیں کہ اگر دین کو دنیا پر قیاس کیا جا سکتا ہے تو بھی حضرت علیؓ کا نمبر چوتھا ہی آتا ہے سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ مستحقِ خلافت ہیں پھر حضرت حسنؓ پھر حضرت حسینؓ۔

ـــ

بہرحال سنی حضرات اگر حضرت علیؓ کو چوتھے نمبر پر رکھتے ہیں تو وہ ان کو ان کے مقام ہی پر رکھتے ہیں ـــ ہاں اس قدر "غلطی" کرتے ہیں کہ ان سے پہلے اصحابِ ثلٰثہ (ابوبکرؓ عمرؓ اور عثمانؓ) کو رکھتے ہیں تاکہ حضرت علیؓ کی باری بھی آسکے، ورنہ اگر پہلے حضرت فاطمہؓ کو خلافت دیں پھر بالترتیب آپ کے دونوں صاحبزادوں کو، تو بتلایا جائے کہ حضرت علیؓ تک خلافت کس طرح پہونچے گی؟ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں صاحبزادوں سے پہلے ہی وفات پا چکے ہوں گے۔ پس سنیوں کی خطا کس قدر عمدہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو محروم نہ ہونا پڑا بلکہ ان کے نمبر پر ان کو حق مل گیا البتہ شیعہ حضرات کے دل سے کوئی پوچھے کہ سنیوں کی یہ "غلطی" "از صد صواب اولیٰ تر" کی مصداق ہے یا نہیں؟

* حدیث: "من کنت مولاہ فعلیٌ مولاہ" مسلّم، مگر "مولیٰ" در اصل ہمچوں "ولی" بمعنی "دوست" آید، ہر دو لفظ از یک مصدر اند، و یک معنی دارند، و پیدا است کہ "ولی اللہ" و "اولیاء اللہ" را کہ ولی و اولیاء می گویند، مراد از آں "دوست خدا" و "دوستان خدا" می باشد، نہ آنکہ ولی و اولیاء بمعنی حاکم و حکام باشد، و مراد آں بود کہ ولی حاکم بر خدا باشد، و اولیاء حکام خدا باشند۔

و زیادہ تر قرینۂ ایں مطلب اینست کہ در آخر ایں حدیث ایں ہم ارشاد است:

(گذشتہ سے پیوستہ) علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ والنہایہ ۷/۳۴۳ - ۳۵۰ میں حدیث زیر بحث کی تمام سندیں جمع فرمادی ہیں فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء (م)

"اللھم وال من والاہ، وعاد من عاداہ" معنی ایں جملہ اینست که: "بارخدایا! دوستِ خویش گرداں آنرا که به علی دوستی کند، و عداوت کن با کسیکه با علی عداوت کند" اگر مطلوب شیعاں مرادِ حدیث بودے، ترجمہ جملہ مذکورہ بدیں طور می شد که: "حکومت کن بر کسیکه حکومت کند بر علی"

علاوہ بریں قصہ ایں ارشاد ایں است که حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رض را بجائے فرستادہ بودند، بعض ہمراہیاں از اوشاں در بعضے کارہا آزردہ، شکایت بخدمتِ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم رسانیدند، چوں شکایت شاکیاں بوجہ غلط فہمی، و ناقدرشناسی حضرت علی بود، حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرمودند: "من کنت مولاہ فعلیؓ مولاہ" یعنی "ہر که من محبوبِ او باشم علی نیز محبوبِ او باشد" بایں ارشاد شکایت از دلِ ہمراہیاں زائل شد، و ہمگناں را معلوم شد که محبت حضرت علی را۔ رضی اللہ عنہ۔ محبتِ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم لازم است۔

و ایں امر عین موافقِ عقل است۔ محبت پیرزادگاں و استاذزادگاں محبتِ پیر و استاذ را لازم است۔ حضرت علی بمنزلۂ فرزند بودند، محبت اوشاں عین محبت حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم باشد اما خلافت و جانشینیٔ پیرزادگاں ضروری نیست، ایں امر مربوط بقرابت نیست، علاقہ به کمالِ علم و کمالِ فقیری دارد، و ہر که دریں امر گوئے سبقت ربودہ باشد، ہماں مستحق خلافتِ استاذ و پیر بود۔ مگر شیعاں قصۂ خلافتِ نبی را۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ بقصۂ ولیعہدیٔ سلاطینِ دنیا قیاس نمودہ حضرت علی را ترجیح می دہند، و نمی دانند که اگر بفرضِ محال دین را بدنیا قیاس تواں کرد، تاہم حضرت علی رض اگر بودند بمرتبۂ چہارم بودند: اول حضرت فاطمہ مستحق خلافت بودند، دوم حضرت حسن، سوم حضرت حسین رضی اللہ عنہم، بہر حال سنیاں اگر حضرت علی را بمرتبۂ چہارم داشتند بجائے خود داشتند۔

آرے ایں قدر خطا کردند که اول از اوشاں اصحاب ثلثہ را نہادند تا نوبت بحضرت علی ہم برسد، ورنہ اگر اول بحضرت سیدۃ النساء دادہ، باز اول اوشاں بعد پسرہا رسیدن خلافت بآنحضرت علی معلوم می شد؟ مگر از دلِ شیعاں باید پرسید که ایں خطا از صد صواب اولیٰ تر است؟ (فیوض صلہ ۱۵۱،۱۴)

اِفادَاتِ قَاسِمیہ

از امامِ کبیر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی

مرتبہ- مولانا سعید احمد پالن پوری، استاذ دار العلوم اشرفیہ (راندیر- ضلع سورت)

(۸) جب ملازمت کی وجہ سے جمعہ وجماعت ادا نہ کر سکے

ایک مسترشد کو تحریر فرمایا:

"نماز روزہ بھی ضروری ہے اور روزگار بھی ضروری ہے۔ اگر جمعہ وجماعت کے چھوٹنے کا رنج بے قرار بنا دیتا ہے تو خدا کا نام لے کر (توکل کر کے) ملازمت ترک کر دو، اور دوسری جگہ تلاش کرو، خداوند قدوس رزاق ہے، کفیل رزق ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ رزق دے گا ہی ـــــ اور اگر ملازمت ترک کرنے کی جرأت بایں وجہ نہیں ہے کہ کوئی دوسری جگہ نظر نہیں آتی تو خاموش بیٹھو" (جب تک کوئی راہ نکلے)۔

"نماز روزہ ہم ضروری، وروزگار ہم ضروری۔ اگر رنج جمعہ وجماعت بے قرار میدارد، بنام خدا ترک دادہ بجائے دیگر تجسس کنند، خداوند رزاق کفیل رزق است، انشاء اللہ تعالیٰ خواہد داد۔ واگر جرأت ترک، بایں وجہ نیست کہ جائے دیگر بنظر نمی آید، خاموش بنشیند"

(مکتوبات قاسمیہ ص۴ مکتوب ۳)

(۹) استاذ کا ادب

"جو شاگرد استاذ کی خدمت میں گستاخ ہوتا ہے، عادت الٰہی یوں جاری ہے کہ علم سے بہرہ ور نہیں ہوتا..... حدیث میں ہے:

مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللهَ۔ 　　یعنی: جو کوئی آدمیوں کا شکر نہ کرے گا وہ اللہ کا بھی شکر نہ کرے گا۔

اور ظاہر ہے کہ ہر چند منعم حقیقی خداوند کریم ہے، پر دولت علم بواسطہ استاد ہی حاصل ہوتی ہے" (اور جو استاذ کا ادب و شکر نہ کرے گا وہ اللہ کا شکر بھی نہ کرے گا پھر اُسے دولت علم کس طرح عطا ہو؟!) 　　(ہدیۃ الشیعہ صہ ۱۷ مطبوعہ حقانیہ کراچی)

(۱۰) کفران زوالِ نعمت کا سبب ہے

شکر پر وعدہ مزید نعمت ہے چنانچہ فرمایا ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ 　　یعنی: اگر شکر کرو گے تو البتہ ہم اور زیادہ دیں گے۔

تو اس صورت میں ۔ بشہادت عقل ۔ کفران پر زوال نعمت متفرع ہونا چاہیے۔" (حوالہ بالا صہ ۱۱)

(۱۱) بزرگی کا مدار

"بزرگی کا مدار" اطاعت خداوندی" پر ہے، چنانچہ کلام اللہ میں خود فرماتے ہیں:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ 　　(الحجرات آیت ۱۳) 　　یعنی: بیشک اللہ کے نزدیک زیادہ تعظیم و تکریم اسی کی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔" 　　(حوالہ بالا صہ ۳۱۶)

(۱۲) گناہ سے باز آجانا توبہ ہے

"وعظ کے سبب جو کوئی گناہ سے باز آئے تو وہ توبہ ہی ہوتی ہے۔ توبہ کے اور کچھ سر سینگ نہیں" (ہوتے) 　　(حوالہ بالا صہ ۲۴۲)

(۱۳) بے وقوفوں کی اصلاح جوئے شیر لانے کے مرادف ہے

"بے وقوفوں کی اصلاح انبیاء سے بھی نہیں ہوتی ..... شاہد اس کا یہ ہے کہ امام غزالی کی بعض کتابوں میں کچھ ایسا لکھا ہے کہ ایک بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوہسار کی طرف بھاگے جاتے تھے۔ کسی نے عرض کی: آپ ایسے افتاں خیزاں اس طرف کیوں جاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ایک نادان آتا ہے! اُس نے عرض کی کہ: پھر آپ کو کیا اندیشہ ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ بے وقوفی کا کچھ

علاج نہیں، وہ کسی کے فیض صحبت یا برکت نصیحت سے زائل نہیں ہوتی، اُلٹے اسی کا اثر پڑ جائے تو پڑ جائے فقط (یعنی امام غزالی کا بیان پورا ہوا) اور کسی نے سچ کہا ہے کہ ؎

لِکُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ یُسْتَطَبُّ بِہٖ　　اِلَّا الْحِمَاقَةَ دَاءٌ لَا دَوَاءَ لَھَا

یعنی: ہر بیماری کا کچھ نہ کچھ علاج ہے جس سے اس کے زائل ہونے کی تدبیر کی جاتی ہے، پر حماقت ایسی بیماری ہے کہ اس کا کچھ علاج ہی نہیں" (حوالۂ بالا ص۳۱۷)

(۱۴) آمدنی کے حلال و حرام ہونے کی بنیاد

"رزق (آمدنی) اپنی حلت و حرمت میں اُن اسباب کا تابع ہوتا ہے جن کے وسیلہ سے وہ رزق حاصل ہو۔ اگر وہ اسباب حرام ہوں تو وہ رزق بھی حرام رہے گا، اور اگر اسباب حلال و مباح ہوں تو وہ رزق بھی حلال و مباح سمجھا جائے گا۔ (مثلاً) اگر رزق تجارت، کھیتی، کھانے پکانے، سینے پرونے کی مزدوری سے میسر آئے، یا اس مال کے عوض مول لیا جائے جو اسباب مذکورہ سے ہاتھ آئے تو اس رزق کو حلال ہی کہیں گے۔ اور اگر سود۔ زنا۔ چوری۔ غصب سے۔ مثلاً۔ ہاتھ لگے تو اس کو حرام ہی کہیں گے۔ جب تک کہ صاحب مال بطیب خاطر۔ بے وجہ۔ اجازت نہ دے اور مباح نہ کرے حلال و مباح نہیں کہہ سکتے۔

اور وجہ اس کی یہی ہے کہ جو شئے جس راہ سے آتی ہے اس کی کیفیت اس کے ساتھ لاحق ہو جاتی ہے۔ دیکھئے نور اگر آئینۂ سبز، زرد، سرخ، سیاہ وغیرہ میں ہو کر آتا ہے تو ان آئینوں کی سبزی، زردی، سرخی، سیاہی وغیرہ اس کے نور کے ساتھ آتی ہیں، آدمی کے نطفہ سے آدمی ہی کی شکل کا بچہ ہوتا ہے تو اسی وجہ سے کہ وہ نطفہ اسی بدن سے آیا ہے، اور گیہوں، چنے وغیرہ کے بیج پر، اور آم، جامن وغیرہ کے تخم پر اگر ویسا ہی اناج اگتا ہے یا ویسا ہی پھل لگتا ہے تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ وجہ اور زمین اس بیج یا تخم کی راہ سے نکل کر باہر آتے ہیں۔

الغرض، جو شئے کسی شئے پر موقوف ہو یعنی بے اس کے اس شئے کے وجود کی کوئی صورت ہی نہ ہو، تو اس شئے کا اثر اس دوسری شئے میں ضرور ہوگا۔" (فیوض قاسمیہ ص۳۴، ۳۵)

(۱۵) حلال ہونا اور ہے قبول ہونا اور

"حلال ہونا اور ہے اور قبول ہونا اور، غرض حلال ہونے کو قبول ہونا لازم نہیں، اور

قبول نہ ہونے سے حرام لازم نہیں آتا، اگر ہماری نماز — خدانخواستہ — قبول نہ ہو، کہ ہم کہیں (ہوں) اور ہمارا دل کہیں (ہو)، تو ارکان ظاہرہ کو — جن کو قیام، قعود، رکوع، سجود کہتے ہیں — حرام نہ کہیں گے .... (یا مثلاً) کفار اگر خدا ہی کی عبادت کریں، خاص اسی کی نیت سے نذر نکالیں یا اسی کی نیت سے نماز، روزہ گزاریں، تو اس کو حرام نہیں کہہ سکتے اگر (چہ)، بوجہ کفران سے ناخوش ہو کر (اللہ پاک) ان کے ان اعمال کو قبول نہ فرمائیں اور ان پر ثواب عنایت نہ ہو۔

(جیسے)، اگر بادشاہِ وقت کسی امیر کا سلام نہ لے اور نذر قبول نہ کرے تو یوں نہیں کہہ سکتے کہ بادشاہ ایسے کاموں سے — یعنی سلام و نذر سے — ناخوش ہوتا ہے، یا ان کاموں کی اس کے یہاں ممانعت ہے۔ اگر یہ بات ہو تو اس امیر کی کیا تخصیص تھی؟ کسی کی بھی نذر نہ لی جایا کرتی، اور کسی کا بھی سلام و نیاز و آداب قبول نہ ہوا کرتا، بلکہ ان باتوں کی ممانعت عام ہو جاتی۔

مگر سب جانتے ہیں کہ آداب بجا لانا، اور نذریں پیش کرنا، علامت تابعداری اور نشانی اطاعت ہے، از قسم معصیت نہیں ہے، ایسے ہی اگر کسی کی عبادت نماز، روزہ، زکوٰۃ، قربانی، نذر، فطرہ، خدا تعالیٰ کی درگاہ میں قبول نہ ہو — جیسے کفار کی عبادت کا حال ہوگا — تو اتنی بات سے اس نماز، روزہ، زکوٰۃ، نذر، قربانی، فطرہ کو گناہ نہیں کہہ سکتے، جو حرام کہہ دیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو ان باتوں کی ممانعت (عام) ہوتی، کسی کے حق میں یہ باتیں طاعت نہ ہو سکتیں۔"

(حوالہ بالا صـ ۳۵)

(۱۶) دینی امور میں بھی ذوق مختلف ہوتے ہیں

"طبائع انسانی و حیوانی باعتبار غذا کے جیسے مختلف ہیں، کہ کسی کو میٹھا بھاتا ہے تو کسی کو نمکین، کسی کو ایک چیز کی طرف رغبت ہوتی ہے، کسی کو نفرت، انگریزوں کو عطر نفیس سے تنفر اور مچھلی کے اچار سے — جسے سونگھ بھی لیجئے تو دماغ چھوڑ، جان کی خیر نہیں — رغبت۔ پاخانہ کے کیڑے گندگی میں خرم و شاد و عیش و آرام سے رہیں، اور خوشبو سونگھیں تو مر جائیں۔ ایسے ہی باعتبار امور دینی کے — جو غذاء ارواح ہیں — ارواح بنی آدم مختلف ہیں، کسی کو رغبت ہو، کسی کو نفرت، کسی کو لذت آتی ہے، کسی کی جان نکل جاتی ہے۔"

(ہدیۃ الشیعہ صـ ۱۶، ۱۷)

(۱۷) تصورِ شیخ

سوال: کیا شیخ کا تصور جائز ہے؟ بعض لوگ منع کرتے ہیں؟

جواب: تصورِ شیخ کی دو صورتیں ہیں اول: شیخ کا تصور واسطہ و رابطہ کے طور پر ہو یعنی وصول الی اللہ کے لیے شیخ کو ذریعہ بنایا جائے اور اصل تصور و ذکر صرف اللہ ہی کا ہو تو یہ جائز ہے، عقلاً بھی اور نقلاً بھی، عقلاً تو اس لیے کہ جب کوئی کام دشوار ہوتا ہے اور کسی کی معاونت سے اس کے سرانجام پانے کی امید ہوتی ہے تو اس شخص سے مدد لینا عقل کا فیصلہ ہے، اور نقلاً بایں وجہ کہ کلمہ طیبہ میں لا الٰہ الا اللہ کے بعد محمد رسول اللہ بھی ہے، جو اسی طرف مشیر ہے۔

"وقتِ یادِ خداوند جل وعلا اگر شیخ را رابطۂ خود تصور کند چہ باک؟! کہ "محمد رسول اللہ" پس از "لا الٰہ الا اللہ" ہمیں جانب مشیر است، و ایں بداں ماند کہ کسے را با کسے کارے افتد — کہ نظرِ عنایت بادداشتہ باشد، و بارِ کارِ خود بر و انداختہ — پس چنانکہ مردِ حاجت مند را بہ تقاضائے ضرورتِ وقت، تدبیر و جانفشانی ہائے خود با و محتاج الیہ ضروریست، و بوجہ مداخلت آں ذکرِ نیاز باو لازم و توسل باو واجب، ہمچناں طالبانِ خدا را یادِ خداوند متعال ضروریست، و نیاز بر رہبرانِ ایں راہ لابدی، و وقتِ عرضِ نیاز اقرار بعدمِ استحقاق و نفیِ لیاقتِ خود لازم، و بدیں وجہ توسل آں مقربان واجب. بالجملہ ایں چنیں تصور شعبہ از اعتقادِ شفاعت است، یا پرتوہ اعتقادِ رسالت، و ہمیں (وجہ) است کہ ایں تصور را اکابرِ طریقت "رابطہ و وسیلہ" نام نہادہ اند۔" (فیوض ص۳۱)

تصور کا طریقہ: "تصور میں (شیخ کی) صورت کا خیال (کرنا) امرِ فضول ہے (جائز طریقہ یہ ہے کہ) جیسے کسی کے تذکرہ کے وقت کسی کا خیال آتا ہے، ایسا ہی تصورِ شیخ میں (چاہیے) مگر (یعنی یہ بھی ضروری ہے کہ اگر) تصور کرو تو اپنے آپ کو اپنی جگہ اور شیخ کو اپنے وطن میں (سمجھو) اور اس کے ساتھ یہ خیال رہے کہ ادھر سے کچھ فیض آتا ہے" (فیوض ص۴۹)

دوم: بالذات اور مستقلاً شیخ ہی کا تصور کیا جائے تو یہ قطعاً ناجائز ہے۔ اور آیت

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِىْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (الانبیاء ۵۲)

یہ کیا (واہیات) مورتیں ہیں، جن (کی عبادت) پر تم جمے بیٹھے ہو؟!

کا مصداق ہے — اگرچہ اس قسم کا تصور کرنے والوں میں عقیدۂ استقلال میں تفاوت کی وجہ سے

تفاوت رہے گا ــــــ کیونکہ قرآن پاک اور حدیث کا واقف یہ ضرور جانتا ہے کہ ذکر و تصور صرف اللہ تعالیٰ کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ وہی جمال و کمال کا مالک ہے۔ لہذا ہر وقت انھیں کا ذکر و فکر اور تصور ہونا چاہیے۔ پس جو شخص اپنے شیخ کا تصور مستقلاً اور بالذات کرتا ہے وہ اس شخص کے مانند ہوگا جس نے اپنے آپ کو بتوں کے لیے وقف کر دیا ہو۔

"آرے اگر تصور مستقل است، و از مفہوم ربط و توسل عاری، آں را مسقط اشارہ ماھذہ التماثیل التی انتم لہا عٰکفون تصور باید فرمود ــــــ گو فیما بین افراد ایں قسم تصور، باعتبار اعتقاد استقلال، فرق باشد ــــــ بالجملہ بخیالِ احقر یاد ایادِ اینکہ، مقتضائے یادِ خدا ایش نتواں گفت، واز یادِ خدا دل محو، یا دیر را خبر نہ باشد، شائبہ از تماثیل مشار الیہا دارد ــــــ گو صاحبِ تصور پیر را حسب اعتقاد اسلام بندہ محتاج اعتقاد کردہ باشد ــــــ چہ یادِ اصلی از حقوقِ خداوندیست، چنانچہ بر ماہران قرآن و حدیث مخفی نخواہد بود، چوں ذکر و یاد ثمرہ محبت است، و محبت اصلی غیر ذات تبارک و تعالیٰ ــــــ کہ اصلِ ہر جمال و کمال است ــــــ نسزد، پس ہر کہ باختیار خود دل بیادِ دیگراں داد، ازیں وجہ دل خود را از یادِ خداوندی پرداخت، و باز ایں کار خود را بنظر استحسان دید، لاجرم رہ کساں رخت کہ بہر بتاں خود را وقف کردہ اند۔"　　　(حوالہ بالا)

تتمہ جواب: جن لوگوں نے تصور شیخ کو منع کیا ہے انھوں نے یا تو قسم دوم کو معمول بہ دیکھا ہوگا یا سداً للذریعہ اور حسماً لمادۃ الفتنہ منع فرمایا ہوگا۔ پس انھوں نے جو کیا وہ بجا کیا۔ لیکن تصور شیخ کی تفصیل و حقیقت وہ ہے جو اس پراگندہ حال نے عرض کی۔ واللہ اعلم

"و چوں ایں صورتِ تصور حاصل شیخ اول (؟) است آنانکہ علی الاطلاق منع کردہ اند، یا ہمیں قسم را معمول بہ یافتند یا رخنہ بندی شریعت و طریقت مدنظر داشتہ، و ہر چہ کردند بجا کردند، اما حقیقت حال ایں است کہ ایں پراگندہ حال بعرض رسانید واللہ اعلم و علمہ اتم"　　　(حوالہ بالا)

اضافہ از حضرت اقدس تھانوی رحمہ اللہ

"تصور کا مفہوم عام ہے "رابطہ" کے مفہوم سے، کیونکہ "رابطہ" ایک خاص شغل کا نام ہے جس میں شیخ کی صورت ذہن میں حاضر کر کے نظر قلب سے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر اور خیال کو سادہ کر کے دیکھا جاتا ہے۔

فیفرض کأنہ حاضر ناظر لکن تصوراً فقط لا اعتقاداً، فانہ شرک، ولذا یمنع منہ العوام وھذا ھو المراد فی کلام بعض الأکابر حیث ادخل ھذا فی عموم قولہ تعالیٰ: ماھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون

(پس شیخ کو ایسا فرض کیا جاتا ہے گویا کہ وہ حاضر ناظر ہے، لیکن صرف تصور و خیال ہوتا ہے، اعتقاد نہیں ہوتا، کیونکہ اعتقاد تو شرک ہے اور اسی وجہ سے عوام کو اس سے منع کیا جاتا ہے، اور یہی مراد ہے بعض اکابر کے اس کلام میں کہ انھوں نے تصورِ شیخ کو باری تعالیٰ کے قول ماھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون کے عموم میں داخل کیا ہے)

یہ تو حقیقت ہے اس کی، اور فائدہ اس کا شغف ہے شیخ کے ساتھ، جس سے بے تکلف اس کا اتباع اخلاق و اعمال میں ہونے لگتا ہے، چونکہ احوال ثمرات ہیں اعمال کے اسلئے وہ احوال بھی اس پر وارد ہونے لگتے ہیں۔

لکن لما کان ضررہ للعوام اکثر من ھذا النفع المذکور، لم یعتبر ھذا النفع فی منعھم منہ۔

(لیکن جبکہ عوام کے لیے اس کا نقصان مذکورہ نفع سے زیادہ ہے تو منع کرنے والوں نے اس نفع کا اعتبار نہیں کیا)۔

اور تصورِ شیخ کوئی خاص شغل نہیں بلکہ اس کی حقیقت وہی ہے جو لغۃً مفہوم ہوتی ہے۔ محل اس کا وہ وقت ہے کہ ذکر کے ساتھ خطرات فاسدہ کا ہجوم ہو، اور دفع کرنے سے مندفع نہ ہوتے ہوں تو منتہی اس کا علاج زیادتِ توجہ الی المذکور سے کرتا ہے اور متوسط زیادتِ توجہ الی الذکر سے، کیونکہ جب نفس کو ایک طرف توجہ تام ہو جاوے گی، حسب قاعدہ فلسفیہ النفس لا تتوجہ الی شیئین فی آن واحد دوسری طرف نہ رہے گی۔ اور مبتدی چونکہ غائب یعنی مذکور کی طرف زیادتِ توجہ کا خوگر نہیں، اور ذکر گو امر حسی مشاہد و مسموع ہے اور توجہ دشوار نہیں، لیکن اس کے ساتھ انجذاب طبعی نہیں اس لیے وہ جمتا

ہیں، اس سبب سے اس کے لیے تصورِ شیخ کو نافع سمجھا گیا ہے کہ وہ محسوس بھی ہے اور محبوب بھی، ہے، اس کا خیال جلدی جم جاتا ہے۔ اور خیال جمنے سے خطرات مندفع ہو جاتے ہیں۔ مگر بعد فارغ پھر اس تصور کو نہیں جماتے کہ اشتغال بغیر المقصود مخل اشتغال بالمقصود ہے ۔۔ اور اس تقریر سے حقیقت کے ساتھ ان دونوں کا نفع بھی معلوم ہو گیا "

(التکشف عن مہمات التصوف صـ ۵۰۲، مطبوعہ ادارہ تالیفات اولیاء دیوبند)

ارشاد حضرت گنگوہی قدس سرہ

کسی کا تصور کرنا بطور خیال کے کچھ حرج نہیں، مگر " رابطہ " جو مشائخ میں مروج ہے۔ ۔ کہ اس کو مشائخ نے کسی علاج کے واسطے تجویز کیا تھا ۔۔ اگر اسی حد پر رہے، کہ جس حد پر ان لوگوں نے تجویز کیا تھا، تو چنداں دشواری (برائی) نہیں، گو ترک اس کا بھی اولیٰ ہے، کہ مختلف فیہ بین العلماء ہے، اور ایسا ضروری بھی نہیں کہ بدوں اس کے کام نہ چل سکے، جو اس حد سے بڑھ جاوے تو البتہ ناجائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاویٰ رشیدیہ صـ ۱۹۶)

(۱۸) تکفیر میں احتیاط

مسلمانوں میں کون ایسا ہے جس کا قرآن پر ایمان نہ ہو؟ لہٰذا حتی الامکان کسی کو کافر نہ سمجھنا چاہیے۔

" در مسلماناں کیست کہ قرآن دین و ایمانِ او نباشد؟ بناءً علیہ تا مقدور کسے را کافر نباید دانست "۔ (فیوض صـ ۲۵ مکتوب ۱۳)

" اپنے خیالِ ناقص میں قطعی کافر تو وہی ہے جس کو خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے کافر فرمایا ہو)۔ ہاں ظاہر میں جس سے افعالِ کفر و کلمات (کفریہ) صادر ہوں ۔۔ اگر ہم کو ان باتوں کے دیکھنے سننے کا خود اتفاق ہو، یا روایت متواترہ ہم تک پہونچ جائے تو اس وقت ۔۔ بظاہر ہم کو اس کے ساتھ معاملات کفر ہی کرنا چاہئیں "۔ (فیوض صـ ۳۲-۳۳ مکتوب ۹)

(۱۹) آخرت میں شراب حلال کیوں ہو گی؟

سوال: شراب جب دنیا میں حرام ہے تو آخرت میں حلال کیوں ہو گی؟ یہاں اور

وہاں کا یہ فرق کیوں؟

جواب: شراب میں دو باتیں ہوتی ہیں ایک نشہ دوسری سرور۔ اور ان دونوں میں اگرچہ تضاد ہے۔ کیونکہ نشہ تو بیہوشی کا نام ہے، کم نشہ ہو تو کم بیہوشی ہوتی ہے اور (اگر) زیادہ نشہ ہوتا ہے تو زیادہ (بے ہوشی ہوتی ہے) اور سرور کے لیے ہوش لازم ہے ـــ لیکن تضاد کے باوجود دونوں باتوں کا شراب میں مجتمع (اکٹھا) ہونا ایسا ہے جیسے تمام مادی مرکبات میں ـــ حتیٰ کہ انسان کے جسم میں بھی ـــ گرمی سردی دونوں کا اجتماع ہوتا ہے، حالانکہ یہ گرمی سردی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی طرح شراب میں بھی دو مختلف چیزوں ـــ یعنی نشہ اور سرور ـــ کا اجتماع ہوتا ہے۔

اب یہ سرور اور نشہ جو شراب میں مجتمع ہیں کسی شئے واحد کا اثر تو ہو نہیں سکتے، لامحالہ ماننا ہوگا کہ نشہ کسی اور چیز کی خاصیت ہے اور سرور کسی دوسری چیز کی تاثیر ہے، مثلاً انسان کے جسم میں حرارت بھی ہے اور برودت بھی، لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ گرمی اور سردی، دونوں ایک چیز کا اثر ہیں۔ بلکہ دو چیزیں (آگ اور پانی) ماننا ہوں گی، جن میں سے ایک کا اثر سردی ہو اور دوسری کا گرمی۔

پھر اگر شراب میں وہ چیز نہ رہے جس کی خاصیت نشہ ہو یعنی قدرت الٰہی کی چھلنی سے چھان کر اس چیز کو جدا کر دیا جائے تو اس وقت شراب میں فقط لذت اور سرور ہی رہ جائے گا اور ہر عقلمند کے نزدیک ایسی شراب حلال ہوگی۔ کیونکہ تمام عقلمندوں، اور شراب کو حرام ماننے والوں کے نزدیک یہ بات مسلمہ ہے کہ شراب کی حرمت کا سبب "نشہ" ہے۔ مسلمان بھی اس کی حرمت اس وقت تک مانتے ہیں جب تک کہ اس میں "نشہ" ہے۔ چنانچہ شراب اگر سرکہ بن جائے اور "نشہ" نہ رہے تو مسلمان اس کے پینے میں باک محسوس نہ کریں گے۔ نیز قرآن و حدیث، و فقہ میں بھی حرمت شراب کی یہی وجہ مرقوم ہے۔[1]

---

[1] کلام اللہ میں ہے: لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاری (النساء آیت ۴۳) "نماز کے پاس ایسی حالت میں مت جاؤ کہ تم نشہ میں ہو"۔ اور ارشاد باری عزاسمہ ہے: قل: فیھما اثم کبیر و منافع للناس (البقرہ آیت ۲۱۹) "آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

بہرحال جب وجہ حرمت "نشہ" ٹھہری۔ اور اس کا مبدا (علت) ایک الگ چیز ہوئی اور اس مبدا کا شراب سے الگ ہونا ممکن ثابت ہوا تو جب اس مادہ کو جدا کر دیا جائے گا تو شراب میں صرف سُرور ہی باقی رہے گا، جو اصل مقصود ہے، کیونکہ جو شخص شراب پیتا ہو وہ سرور کی خاطر پیتا ہے، بیہوشی کے لیے نہیں پیتا، کلام اللہ میں بھی جنت کی شراب میں لذت کا تو اثبات[۱] ہو۔ جو سرمایہ سرور ہے — اور نشہ کی نفی ہے — جو وجہ ممانعت ہو۔ ارشاد[۲] باری ہے:

لَا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ (الطور) — (وہاں آپس میں جام شراب میں چھینا جھپٹی بھی کریں گے کہ) اس میں نہ بکبک لگے گی اور نہ کوئی بیہودہ بات ہوگی

(انتصار الاسلام صد ۳۹–۴۰ در جواب اعتراض نمبر ۲ ترتیب اور عبارت کے تغیر کے ساتھ)

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) اور لوگوں کو فائدے بھی ہیں" یعنی ان کے استعمال سے اکثر اوقات دوسری باتیں گناہ کی پیدا ہو جاتی ہیں، کیونکہ شراب سے عقل جاتی رہتی ہو اور وہی مانع تھی ارتکاب معاصی سے (بیان القرآن ۱/۱۲۴) اور ارشاد ہو انما یرید الشیطٰن الآیۃ (المائدہ آیت ۹۱) "شیطان تو یوں چاہتا ہو کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض واقع کر دے، اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے تم کو باز رکھے، سو اب بھی باز آؤ گے؟" شراب میں عقل نہیں رہتی، گالی گلوج، دنگہ فساد ہو جاتا ہے الخ (بیان القرآن ۳/۵۸)

عن ابن عمر: قال خطب عمر علی منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: .... والخمر ما خامر العقل (رواہ البخاری)، وعن عائشۃ قالت: سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن البتع؟ — وھو نبیذ العسل — فقال: کل شراب اسکر فھو حرام متفق علیہ (مشکوٰۃ جلد ۳۱۷)

[۱] ارشاد باری عز اسمہ ہے: وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ (محمد آیت ۱۵) "اور بہت سی نہریں ہیں شراب کی جو پینے والوں کو بہت لذیذ معلوم ہوں گی۔"

[۲] سورۃ الواقعہ میں ہے لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ (نہ اس سے ان کو درد سر ہوگا اور نہ اس سے عقل میں فتور آوے گا) اور سورۃ وَالصّٰٓفّٰتِ (آیات ۴۵، ۴۶، ۴۷) میں ہے یطاف علیھم بکأس من معین بیضاء لذۃ للشربین، لا فیھا غول ولا ھم عنھا ینزفون (ان کے پاس ایسا جام شراب لایا جاوے گا جو بہتی ہوئی شراب سے بھرا جاوے گا، سفید ہوگی، پینے والوں کو لذیذ معلوم ہوگی۔ نہ اس میں درد سر ہوگا اور نہ اس سے عقل میں فتور آوے گا۔" اللھم ارزقنا شراب محبتک ومن شراب جنتک۔ (آمین)

افاداتِ قاسمیہ

از امام کبیر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی

(۳)

(مرتبہ مولانا سعید احمد پالن پوری دار العلوم اشرفیہ۔ راندیر ضلع سورت)

(۲۰) بتوں پر چڑھائے ہوئے جانوروں کے خریدنے کا حکم

سوال:۔ بتوں پر چڑھائے جانے والے جانور اگر سادھو یا چوری کرنے والے فروخت کردیں تو ان کا مول لینا جائز ہے یا نہیں؟۔

جواب: بعد حمد وصلوٰۃ معروض ہے کہ مسئلے کی کئی صورتیں ہیں:۔

پہلی صورت:۔ اگر کوئی کافر — ہندو ہو یا نصرانی — خدا کے نام کی نذر نکالے اور کسی ہندو یا مسلمان کو دیدے تو اس شے کو حرام نہیں کہہ سکتے (جیسا کہ افادہ نمبر ۱۵ میں بیان ہوا) اس کو (موہوب لہ کو) اختیار ہے (کہ چاہے) خود کھائے یا کسی اور کو کھلائے، غیر کے ہاتھ بیچ دے یا غیر کو ہبہ کردے، پھر وہ غیر آپ رکھے یا کسی کو دے دے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ فعل (یعنی اللہ کے لیے نذر نکالنا) اصل سے (یعنی در حقیقت) حرام نہیں ہے۔ اس لیے جو مال اس راہ سے آیا ہے اسے حرام نہیں کہہ سکتے (جیسا کہ افادہ نمبر ۱۲ میں بیان ہوا)۔ البتہ مسلمان کے حق میں — بشرطیکہ نذر کرنے والا کافر خود اس مسلمان کو دے — لینا کراہت سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ لینے والا خدا کی طرف سے لیتا ہے۔ اور جب خدا کے یہاں

قبول ہی نہیں تو اس سلمان کا لینا ایسا سمجھئے، جیسے بادشاہ کے سامنے ہدیہ، نذرانہ پیش کیا گیا، اس نے ناراض ہو کر ہدیہ رد کر دیا، اور نذرانہ قبول نہ کیا۔ لیکن خدمتگار شاہی نے بادشاہ کی طرف سے اُسے لے لیا۔ تو جیسے یہ بات بادشاہ کو مکروہ (ناگوار) معلوم ہوگی، ایسے ہی خدائے تعالیٰ کے ان کا قصہ سمجھئے۔ لیکن جیسے وہ خدمت گار اگر کسی کے ہاتھ بیچ دے یا کسی کو دے دے تو اس لینے پر مشتری یا لینے والا معتوب شاہی نہیں ہوتا۔ ایسے ہی یہاں بھی سمجھ لیجئے۔

دوسری صورت: اور اگر نذر خدا کے نام کی نہیں ہے کسی اور کے نام کی ہے (یعنی وہ نذر کسی سادھو، سنت، بشپ، پادری یا بزرگ کے نام کی ہے) تو جس طرح یہ نذر نکالنا حرام اور شرک ہے ایسے ہی اس مال کو بھی حرام اور ناپاک سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ شرک کو (اللہ پاک نے) ناپاک فرمایا ہے۔ کلام اللہ میں موجود ہے:۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (تو تم لوگ گندگی سے یعنی بتوں سے کنارہ کش
(الحج۔ رکوع ۱۰) رہو" ترجمہ تھانوی")

عربی داں جانتے ہیں کہ "رجس" ناپاک کو کہتے ہیں۔ پھر ناپاکی اگر ظاہری ہوتی تو معاملہ سہل بھی تھا۔ شرک سے (تو) دل ناپاک ہو جاتا ہے۔ پھر سات سمندر سے بھی دھویا جائے تو بھی وہ پاک نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب نذر ایسے ناپاک دل سے نکلی ہو تو اس دل کی گندگی اس نذر میں آجائے گی۔

پھر جیسے وہ نور جو سبز، زرد آئینہ میں ہو کر نکلا ہو، وہ کہیں (رنگ) جائے سبزی، زردی اس کے ساتھ جاتی ہے، یا جیسے اناج، گیہوں، چنے، جَو کے بیج میں سے ہو کر باہر آتا ہے اس لیے گیہوں، جو، چنے کی شکل وخاصیت وغیرہ اس کے ساتھ رہتی ہے، یا جو پھل، آم، جامن، وغیرہ کی گٹھلیوں میں سے ہو کر باہر آتے ہیں، ان کے ساتھ کہیں تک جاؤ آم کی شکل اور خاصیت ساتھ ساتھ جاتی ہو۔ علیحدہ نہیں ہوتی (جیسا کہ افادہ ۱۲ میں بیان ہوا) ایسے ہی جو مال حرام طریقہ سے آئے گا وہ کہیں تک جائے گا اس کی حرمت اس کے ساتھ ساتھ جائے گی۔

اور ایسی ناپاک (حرام غذا) سے جو دل اور بدن پیدا (پرورش) ہو گا اس سے جو عبادت ہو گی وہ قبول نہ ہوگی۔ کیونکہ اس عبادت میں ناپاکی کا لگاؤ ہو گا۔ اور ظاہر ہے کہ ناپاک کام اس پاک درگاہ میں کیوں قبول ہونے لگے۔؟!

اس لیے اگر سادھو وغیرہ لے کر کسی کے ہاتھ بیچ دیں یا کسی کو ہبہ کر دیں تو خریدار اور لینے والے کے حق میں وہ مال حرام ہی رہے گا، حلال نہ ہوگا، جیسے خنزیر کا گوشت ___ بیچو یا ہبہ کرو ___ حلال نہیں ہو سکتا۔

تیسری صورت: اگر پوجا کرنے والے اس مال کو کسی کو دیں نہیں۔ یوں ہی چھوڑ دیں اور پھر اس کے بعد کسی کے لینے کے روادار بھی نہ ہوں، بلکہ لینے سے ناخوش ہوں ___ جیسے اس طرف میں ہندو گائے بیل معبودوں کے نام پر چھوڑ کر مطلق العنان کر دیتے ہیں اور ان کو "سانڈ" کہتے ہیں اور کسی کو اجازت ان کے پکڑ لینے کی نہیں دیتے ___ تو ایسے جانوروں کو اگر مجاہدین غنیمت میں لے جائیں تو ان کو بلا کراہت اس قسم کے جانوروں کا کھانا جائز ہوگا بلکہ وہ جانور جو پوجا کرنے والے اپنے آپ زنار داروں کو دیتے ہیں اُن کا کھانا بھی درست ہوگا۔

ورنہ (یعنی مجاہدین کے علاوہ کے لیے) بوجہ غصب دُزدی (چوری) اور بوجہ پوجا و پرستشِ غیرِ خدا کراہت رہے گی۔

دُزدی کی وجہ سے جو حرمت ہے وہ تو ظاہر ہے پر یہ بات تأمل طلب ہے کہ پوجا کی وجہ سے کراہت ہے۔ کیونکہ پوجا کی وجہ سے ہوتی تو حرمت ہوتی، کراہت نہ ہوتی۔ اس لیے یہ عرض ہے کہ پوجا کو اس مال کے حصول میں کوئی دخل نہیں، جیسے اور مال چراتے ہیں ایسے ہی یہ مال بھی چرا لیا۔ اس لیے یوں نہیں کہہ سکتے کہ اس مال کا حصول لینے والوں کے حق میں پوجا پر موقوف تھا، ہاں چوری پر یا غصب پر موقوف کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے یوں کہنا ضرور ہے کہ شرک کی ناپاکی اور حرمت تو یہاں مؤثر نہیں ہوئی البتہ چوری اور غصب کی حرمت نے اس مال کو حرام کر دیا۔

بہرحال حرام ہونے میں کچھ شک نہیں بلکہ حرمت سے ایک نمبر زیادہ ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ کسی شخص نے ایک سفر میں ایک ناقہ (اونٹنی) پر لعنت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نے یہ فرمایا کہ ہمارے ساتھ شتر مادہ ملعون نہ رہنے پائے اور یہ فرما کر اس ناقہ کو چھوڑ دیا[1]۔ جب بندوں

---

[1] عن عمران بن حصین، قال: بینما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی بعض اسفارہ، و امرأۃ من الانصار علی ناقۃ، فضجرت، فلعنتھا، فسمع ذلک رسول اللہ صلی اللہ علیہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

کی لعنت کا یہ اثر ہو کر ساتھ رہنے میں حرج نظر آئے تو لعنت خداوندی میں یہ اثر کیونکر نہ ہوگا؟!

یہی وجہ ہوئی کہ قوم ثمود کے کنوئیں سے پانی پینے کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے اصحاب کو منع فرمایا، اور اس پانی سے گندھے ہوئے آٹے کو نہ کھانے دیا لہ اور سب جانتے ہیں کہ اسی کو لعنت کہتے ہیں کہ رحمت سے دور کر دیجئے، نظر عنایت سے علیحدہ کر دیجئے، اور ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا رحمت سے دوری ہوگی (کہ) اپنے آپ تو جدا رہے، اپنے بندوں کو بھی اس طرف دیکھنے نہیں دیا۔

غرض بوجہ لعنت ثمود کے کنوئیں کے پانی کے استعمال سے منع فرمایا اور جب اس پانی کے استعمال سے ممانعت ہے تو اس جانور کے کھانے سے بدرجۂ اولیٰ ممانعت ہوگی جس کو پرستش غیر خدا میں مطلق العنان بنا دیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ثمود کے کنوئیں کا پانی بذات خود سامان شرک نہ تھا البتہ مشرکوں کے نام لگا ہوا تھا، اس چاہ پر ان کا آنا جانا تھا، اس چاہ سے پانی پی کر اپنی پیاس بجھاتے تھے اس چاہ کے پانی سے آٹا گوندھ گوندھ کر روٹیاں پکاتے تھے اور کھاتے تھے اور پانی اور روٹی کھا پی کر توانا ہو کر شرک و کفر وغیرہ کرتے تھے غرض (اس) شرک سے جو زمانۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود تھا ایک دور کا

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) وسلم، فقال: "خذوا ما عليها ودعوها، فإنها ملعونة." قال عمران: فكأني أراها الآن تمشي في الناس ما يعرض لها احد وفي رواية: فقال النبي صلى الله عليه وسلم "لا تصاحبنا ناقة عليها لعنة" (رواهما الامام مسلم في صحيحه ۲/۳۲۳) قال النووي: والمراد النهي عن مصاحبته صلى الله عليه وسلم في الطريق واما بيعها وذبحها وركوبها في غير مصاحبته صلى الله عليه وسلم وغير ذلك من التصرفات، التي كانت جائزة قبل هذا فهي باقية على الجواز، لان الشرع انما ورد بالنهي عن المصاحبة، فبقي الباقي كما كان (الخ)

لہ عن ابن عمر: ان الناس نزلوا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم على الحجر، ارض ثمود، فاستقوا من آبارها، وعجنوا به العجين، فأمرهم رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يهريقوا ما استقوا ويعلفوا الابل العجين.

(مسلم شریف ۲/۴۱۱)

علاقہ تھا۔ اور جانور مذکور سے ـــــ جس کو بوجہ پرستش بتاں وغیرہ معبودانِ باطل ـــــ شرک کو یہ (یعنی ایسا) رابطہ ہے (کہ) اس سے زیادہ (رابطہ) کیا ہوگا؟! یعنی اس جانور ہی پر، وہ اُن کی پرستش موقوف تھی، وہ شرک بے جانور وغیرہ متصور نہیں، جیسے قربانی اہلِ اسلام بے جانور ممکن نہیں۔ اور (جب) اس قدر ارتباط ہے کہ شرک اس پر موقوف ہے تو وہ لعنت، مذکورہ آب چاہ مذکورہ کی لعنت سے کہیں بڑھ کر ہوگی۔ اور اس لیے یہ لعنت اور وہ چوری دونوں مل کر قریب دو علتوں کے ہو جائے گی۔ جس سے حرمت ثابت ہو چکی۔

چوری کی حرمت تو ظاہر ہے۔ اور لعنت کی کراہت، حرمت سے برائے نام ہی کم ہے، کیونکہ ایسی کراہت کو تحریمی کہیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ کراہت تحریمی ہم پلہ حرمت ہوئی، بالجملہ اس قسم کے جانور اور اموال جن کا سوال مذکورہ ذکر میں ہے سب کے سب ناجائز ہیں۔ اہلِ اسلام کو ان کا کھانا روا نہیں۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال فقط مورخہ ششم ماہ صفر ۱۲۹۵ھ

(فیوض قاسمیہ ص ۳۶-۳۸ معمولی تغیر کے ساتھ)

اضافہ از مرتب

دوسری صورت کا حاصل یہ ہے کہ جو بکرا، مرغا، گائے وغیرہ کی نذر سادھو سنت، بزرگ، تھان، نشان اور جھنڈے وغیرہ کے نام کی ہے۔ یعنی وہ نذر اس لیے ہے کہ وہ بزرگ ہم سے خوش ہوں اور ہمارا کام کر دیں، اور ان کو متصرف بالتکوین سمجھے، اور ان سے تقرب کے لیے ذبح کرے۔ اور ذبح سے وہی مقصود ہوں جیسا کہ اس زمانے میں اکثر جہال کا یہی عقیدہ ہوتا ہے تو یہ عقیدہ رکھنے والا مشرک اور وہ ذبیحہ بالکل حرام ہے، خواہ چڑھانے والا مسلمان ہو یا ہندو اور خواہ بوقت ذبح اللہ کا نام لیا جائے یا غیر اللہ کا۔ یہ جانور۔ مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اور وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ کا مصداق ہیں۔ لہٰذا ان کا خریدنا حرام ہے۔ البتہ اگر اللہ کے واسطے جانور ذبح کیا جائے اور اللہ ہی کے واسطے صدقہ کر کے اس کا ثواب کسی بزرگ کی روح کو بخشا جائے تو یہ جائز اور حلال ہے۔

(امداد الفتاوی ۲/۵۵۳ و ۵۶۲ مطبوعہ کراچی)

تیسری صورت کا حاصل یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ اور تعظیم غیر اللہ کے لیے چھوڑ دیا جائے، نہ اس سے کام لیں نہ اس کے ذبح کرنے کا قصد ہو۔ یہ جانور بحیرہ اور سائبہ ہیں اور ما اھل

بہ لغیر اللہ اور وما ذبح علی النصب میں داخل نہیں ہیں اس لیے ان کا حکم یہ ہے کہ یہ فعل (سانڈ بنانا) تو بنص قرآنی حرام ہے لقولہ تعالیٰ: ما جعل اللہ من بحیرۃ ولا سائبۃ الآیۃ۔ لیکن ان جانوروں کی حرمت صرف بوجہ ملک غیر ہونے کے ہے، جب مالک کسی کو ان کے ذبح کرنے اور کھانے کی اجازت دے دے تو وہ حلال ہیں۔

حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ صاحب دہلویؒ سے پوچھا گیا کہ ہنود اپنے دیوتاؤں کے یا مُردوں کے نام پر گائے کو داغ لگاکر یا بلا داغ چھوڑتے ہیں، جس طرح بعض مسلمان شیخ سدو یا پیران پیر وغیرہ کے نام بکرا یا مرغ چھوڑتے ہیں۔ اسی طرح ہنود گائے کو متبرک سمجھ کر چھوڑتے ہیں، اُن کو ذبح کرکے گوشت کھانا جائز ہے یا ناجائز؟ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کا جواب مندرجہ ذیل ہے:۔

الجواب: جو جانور بتوں کے نام پر یا کسی غیر اللہ کے نام چھوڑے جاتے ہیں۔ اور اُن کی جان لینا مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف کام لینے سے آزاد کرنا مقصود ہوتا ہے اور ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل نہیں ہیں اُن کو سائبہ کہتے ہیں اور ان کی حرمت صرف بوجہ ملک غیر ہونے کے ہے کہ وہ مالک کی ملک سے خارج نہیں ہوتے اگر مالک کسی کو ان کے ذبح کرنے اور کھانے کی اجازت دیدے تو وہ حلال ہیں اور ایسی گایوں کی اولاد بھی مالک کی ہوتی ہے۔ پس ان گایوں کو یا ان کی اولاد کو بلا اجازت مالک کے کھانا حلال نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

محمد کفایت اللہ۔ دہلی

الجواب صحیح علی ما قال مولانا کفایت اللہ سلمہ (مولانا) اشرف علی (تھانوی قدس سرہ)

(فتاویٰ دار العلوم قدیم جلد ۷، ۸ صفحہ ۱۷۰)

الحاصل: سوائب کی حلّت کے لیے مالک کی اجازت ضروری ہے۔ اس کے بغیر ان جانوروں کے حلال ہونے کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔ اور چونکہ حضرت الامام النانوتوی رحمہ اللہ سے یہ پوچھا گیا تھا کہ اس قسم کے جانوروں کو سادھو بیچ دیں یا اور کوئی چوری کرکے فروخت کرے تو ان کا خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مالک کی اجازت نہیں پائی گئی اس لیے بوجہ ملک غیر ہونے کے یہ غصب اور دزدی ہوئی۔ پس حضرتؒ نے لکھا کہ نہ ان کا خریدنا جائز ہے نہ مفت لینا جائز ہو۔

نہ ان کو ذبح کر کے کھانا جائز ہے، البتہ مجاورین لے جا سکتے ہیں کیونکہ ملک مالک ان کے حق میں مؤثر نہیں ہے۔

حضرت الامام رحمہ اللہ نے صورتِ دوم وسوم کے درمیان فرق پر بھی بحث فرمائی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ دوسری صورت میں وہ جانور نذر لغیر اللہ کی وجہ سے ہی حاصل ہوا ہے، یعنی ناذر نے نذر ہی کی وجہ سے وہ جانور سادھو یا فقیر کو دیا ہے اگر وہ نذر نہ مانتا تو سادھو اور فقیر کو یہ جانور حاصل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پس پرستشِ غیر خدا اس جانور کی ذات سے متعلق ہوئی اور چونکہ نذر لغیر اللہ شرک ہے اس لیے اس راہ سے آیا ہوا مال ناپاک ہوگا، پس وہ جانور حرام ہوگا خواہ وہ سادھو یا فقیر کے پاس رہے یا وہ کسی کو بیچ دے یا ہبہ کر دے۔

اور تیسری صورت میں سادھو نے یا چوری کرنے والے نے جو جانور حاصل کیا ہے وہ نذر لغیر اللہ کی وجہ سے حاصل نہیں کیا بلکہ چوری یا غصب سے حاصل کیا ہے۔ کیونکہ چوری یا غصب جس طرح اور مال کا ہوتا ہے اسی طرح منذور لغیر اللہ کا بھی ہوتا ہے۔ بہر حال اس جانور کے حصول کا ذریعہ غصب اور دُزدی ہے، نذر لغیر اللہ نہیں ہے۔ ہاں البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ پرستشِ غیر خدا کا تعلق اس جانور سے ہوا ہے اور یہ تعلق ہے بھی کافی قوی جیسے قربانی کا تعلق جانور سے ہوتا ہے اس لیے لعنتِ خداوندی کا سزاوار ہوگا، لیکن اس کے باوجود پرستشِ غیر خدا اس مال کے حصول کی راہ نہیں ہو بلکہ حصول کی راہ غصب اور دُزدی ہے، برخلاف صورتِ دوم کے کہ وہاں مال حاصل ہونے کی راہ ہی نذر لغیر اللہ ہے اس لیے دونوں صورتوں کے حکم میں فرق ہوا۔

اب رہی یہ بحث کہ اگر صورتِ دوم وسوم، دونوں میں، مالک خود اس جانور کو ذبح کر کے کھانے کی اجازت دے تو دوسری صورت میں اس کا کھانا حرام ہے اور تیسری صورت میں جائز ہے۔ یہ فرق کیوں؟ کیونکہ اب دُزدی اور غصب کا واسطہ صورت سوم میں بھی نہیں رہا۔ پس دونوں قسم کے جانوروں کے حصول کی راہ ایک ہوگئی پھر فرق کیوں ہے؟ تو وجہ فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں ان چیزوں کا استعمال کرنا نذر کرنے والے کی ناجائز غرض کی تکمیل ہے اور اس کی اعانت ہے کیونکہ اس نے سادھو کو یا فقیر کو کھلانے ہی کے لیے یہ جانور دیا ہے اس لیے اس کی حرمت جو آیت ما اھل بہ لغیر اللہ سے ثابت ہوئی تھی وہ مالک کے اجازت دینے کی صورت میں بھی بجا تھا قائم رہی۔ اور تیسری صورت

میں چونکہ سوائب کا ذبح کرنا مقصود نہیں ہوتا، اس لیے ان کے ذبح کرنے اور کھانے میں ناذر کی غرض کا ابطال ہے اس لیے اس کے ذبح کرنے اور کھانے کی فی نفسہ تو اجازت ہے لیکن مالک کے حق کی وجہ سے ممانعت تھی۔ پس جب مالک فروخت کردے یا بلا معاوضہ کسی کو دیدے تو اس کا کھانا جائز ہوگا۔

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ وہ نذریں جو غیر اللہ کے لیے ہوں اور از قبیل حیوانات نہ ہوں جیسے شیرینی، پھول وغیرہ ان کا کھانا مالک کی اجازت سے بھی درست نہیں ہے، مالک کے اجازت دینے کے باوجود وہ حرام رہیں گی، کیونکہ ان چیزوں کا استعمال کرنا نذر کرنے والے کی باطل کی غرض کی تکمیل ہے اور اس کی اعانت ہے۔ اور سوائب میں ان کو ذبح کرنے اور کھانے میں نذر کرنے والے کی غرض کا ابطال ہے۔ اور نہ کھانے میں اس کی تکمیل ہے۔

الحاصل شیرینی وغیرہ اجازت کے باوجود حرام ہی رہیں گی۔ اس کے حلال ہونے کی شرط یہ ہے کہ ناذر توبہ کرے اور اپنی نذر سے رجوع کرے پھر اجازت دے تب اس کا کھانا حلال ہے فسبحان الذی لاشریک لہ فی الملک والمال۔

(۲۱) جنت میں جنتیوں کے فضلات نہ ہونے کی وجہ

سوال: جنت میں جنتیوں کے فضلات (پیشاب، پاخانہ وغیرہ) نہ ہوں گے، وجہ کیا ہے؟ جبکہ وہاں وہ کھائیں گے پیئیں گے؟

جواب: اس لیے کہ جنت کی غذاؤں میں فضلات نہ ہوں گے، صرف جوہر ہی ہوگا، اس لیے کھانے والوں کے بھی فضلات نہ ہوں گے ___ اور غذاؤں کا یہ فرق کہ کسی میں فضلہ زیادہ ہوتا ہے کسی میں کم سب کے نزدیک مسلّم ہے، پس اگر کوئی ایسی غذا ہو جس میں فضلہ ہو ہی نہ تو کیا محال ہے؟ مثلاً زمین کی قوتِ نامیہ کی چھان پھٹک سے زمین سے اجزائے نباتی نکلتے ہیں اور زمین کے دیگر کثیف اجزاء زمین ہی میں رہ جاتے ہیں۔ پھر اللہ کی قدرت اجزاء نباتی کا خلاصہ کرکے اس سے غلہ اور میوے بناتی ہے اور کثیف اجزاء درخت، گھاس پھونس، اور بھوس کی شکل میں باقی رہ جاتے ہیں پھر انسان اس غلہ کو صاف کرکے، پیس چھان کر کے کھاتے ہیں۔ لیکن اب بھی

بہت سے اجزاءِ کثیفہ اس میں باقی رہتے ہیں، پھر معدہ کا عمل شروع ہوتا ہے۔ وہ اس کی صفائی کرتا ہے۔ وہاں پکنے کے بعد فضلات تو آنتوں میں چلے جاتے ہیں اور باقی ماندہ مادہ (چاول کی پیچھ کی طرح کا جسے کیلوس کہتے ہیں) جگر کی چھلنی میں چھنتا ہے۔ اور اس میں سے پیشاب علیحدہ ہوتا ہے اور اخلاطِ اربعہ ـــ سوداء، صفراء، دم اور بلغم ـــ جدا جدا ہو جاتے ہیں۔ پھر یہاں سے دم (خون) قلب کی طرف جاتا ہے اور وہاں پکتا ہے۔ قلب کی حرارت کی وجہ سے اس میں سے ایک بھاپ اٹھتی ہے جو تمام بدن میں پھیل جاتی ہے۔ یہ بھاپ "روحِ ہوائی" کہلاتی ہے (اطباء اس روح کو "روحِ حیوانی" کہتے ہیں جس پر حیات کا مدار ہے)

بہر حال یہ بھاپ (روحِ ہوائی) اگر بالفرض برف کی طرح جم جائے اور اس کو کھائیں تو اس غذا سے فضلہ پیدا نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ غذا اصل میں "ہوا" ہوگی۔ اور اس صورت میں اگر آئے تو ڈکار[1] آجائے۔ اور اس طرح کھایا ہوا نکل جائے۔ اور پیٹ خالی ہو جائے۔ بس یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ جنتیوں کو پیشاب پاخانہ کی حاجت کیوں پیش نہ آئے گی؟ (انتصار الاسلام صـ۳۹ توضیح کے ساتھ)

(۲۲) إِنَّ لِلّٰهِ مَا أَخَذَ، وَلَهُ مَا أَعْطَىٰ

"اصل مالک (ہر شے کا) اللہ تعالیٰ ہی ہو۔ بندوں کی جان و مال سب اسکی ملک ہو، بندوں کی ملک اسکی ملک کے سامنے ایسی ہو، جیسے رعیت کے گھر کو رعیت کا گھر کہتے ہیں۔ وجہ اس (تشبیہ) کی سبھی جانتے ہیں کہ، جیسے اصل مالک کو اس بات کا اختیار ہوتا ہو کہ اپنی رعیت کو اپنے مکان میں چاہے رکھے، چاہے نکالدے، اور رعیت والوں کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ اس مکان پر چاہیں (تو) اصل مالک کو تصرف کرنے دیں، چاہیں نہ کرنے دیں، ایسے ہی خدائے تعالیٰ کو اس بات کا اختیار حاصل ہو کہ جو چیز چاہے مخلوقات کے پاس رہنے دے (اور) جو چاہے ان سے لے لے، پر مخلوقات کو یہ اختیار نہیں کہ جو چیز چاہیں، جونسی چاہیں، نہ جانے دیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو کاہے کو کوئی اپنے خویش و اقرباء کو مرنے دیتا؟ اور کاہے کو کوئی غنی مفلس ہوا کرتا؟ جان و مال ہمیشہ کو رہا کرتا۔　　(فیوض صـ۳۵)

---

[1] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جنتی جنت میں کھائینگے پیئنگے لیکن قضائے حاجت نہ کرینگے، نہ پیشاب کرینگے، نہ تھوکیں گے، نہ ناک صاف کرینگے، ان کا کھانا ڈکار اور مشکی پسینہ ہوگا" مسلم ۲/۳۷۹، کتاب الجنۃ باب صفات الجنۃ و اہلہا۔ مسند احمد ۲/۳۱۶ مسند جابر بن عبد اللہ